29

خدا تعالیٰ کے ہر قانون کو رحمت سمجھو اور اس سے بچنے کی کوشش نہ کرو

(فرمودہ 26 ستمبر 1941ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سورۃ الرحمٰن کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ 1

"یوں تو مسلمان کے سارے ہی خطبے قرآن کریم کے مطالب پر ہی مبنی ہوتے ہیں کیونکہ اسلام میں جو کچھ ہے اور احمدیت میں جو کچھ ہے وہ یا تو نصِ صریح سے قران کریم سے ملتا ہے یا استدلالات سے قرآن کریم سے نکلتا ہے اور بہرحال قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہوتا ہے۔ مگر رمضان شریف کی نسبت کے لحاظ سے مَیں نے مناسب سمجھا کہ رمضان کے خطبات مَیں قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت پر پڑھا کروں تاکہ وہ بھی ایک قسم کا درس بن جائے۔ گو اس طرح خطبہ پڑھا جائے تو سارے رمضان میں چار ہی آیات آتی ہیں مگر قرآن کریم کی چار آیتیں بھی چاروں کوٹ کی برکتیں اپنے اندر رکھتی ہیں اور بعض اکیلی اکیلی آیات یا مختصر سورتوں کے متعلق رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ وہ نصف قرآن کے برابر یا

قرآن کا خلاصہ ہیں تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک ہی آیت بعض لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہو جائے اور ان کی طبیعت کی اصلاح میں مُمِد ہو جائے۔

یہ آیات جو مَیں نے ابھی پڑھی ہیں سورہ رحمٰن کی ہیں اور شاید ان چند آیتوں میں سے ہیں جن کے متعلق قریباً سب مفسرین ایک ہی رائے رکھتے ہیں۔ مَیں نے اس بارہ میں چند مشہور تفاسیر کو دیکھا ہے جو احادیث سے لکھی گئی ہیں جیسے دُرِ منثور۔ یا عقل سے لکھی گئی ہیں جیسے کشّاف یا جو عقلی استدلال کے ساتھ بزرگوں کے اقوال کو بھی لیتی ہیں جیسے امام شوکانی کی تفسیر ہے۔ یہ سب کی سب اس آیت کے بارہ میں متفق ہیں اور وہ اس کے معنے یہ کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ وہ کہیں بھی بھاگ کر جانا چاہے خدا تعالیٰ کا عذاب اسے مل جاتا ہے۔ اس سے بچنے کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی فوجوں پر انسان غلبہ حاصل کر لے اور پھر وہ اس میں محذوف نکالتے ہیں کہ یہ غلبہ انسان کہاں حاصل کر سکتے ہیں۔ پس اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ کے عذاب سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا۔

آج سے نہیں گزشتہ سالہا سال سے شاید 20،25 سال سے مَیں اس آیت کے متعلق ان مفسرین کی رائے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ اول تو میرے نزدیک یہاں عذاب کا ذکر نہیں۔ بے شک بعد میں عذاب کا ذکر آتا ہے مگر اس عذاب سے بھاگنے کا جس کو بعد میں بیان کیا گیا ہے پہلے ذکر کرنا قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تحسینِ کلام میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نتائج کو پہلے بیان کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس صورت میں جملہ میں جوڑ اور نسبت قائم کی جاتی ہے لیکن یہاں تو دو متفرق آیات ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ رکھا ہے۔ پھر مَیں یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ قرآن کریم جیسی کتابِ حکیم خالی عذاب کو جس کے ساتھ کوئی پہلو آرام و آسائش اور راحت کا نہ ہو بیان کرنے کے بعد فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ فرمائے جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے رب کی کون کون سی

نعمتوں کا انکار کرو گے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ کوئی کہے مَیں مار مار کر تمہارا بھرکس نکال دوں گا تم میرے کون کون سے انعام کا انکار کرو گے۔ مَیں تمہیں قید کر دوں گا پس تم میرے کون کون سے انعام کا انکار کرو گے۔ یہ طرزِ بیان قرآن کریم کی شان کے خلاف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض عذاب بھی رحمت کا موجب ہوتے ہیں۔ جیسے سورۂ فاتحہ کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ 2 سے شروع کیا مگر بعد میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ 3 فرمایا اوراس میں سزا بھی داخل ہے۔ یعنی کلام اَلْحَمْد کے ساتھ شروع کیا گیا اور سزا کو شامل کر لیا گیا ہے۔ مگر اس میں رحمت کا پہلو موجود ہے۔ ابتدائی عمر میں مَیں نے ایک دفعہ ستیارتھ پرکاش کے بعض اعتراضات کا جواب لکھنا شروع کیا تھا اور سورۂ فاتحہ پر اعتراضات کا جواب لکھا تھا۔ اس زمانہ میں سوامی دیانند صاحب کے ایک بڑے مقرب دوست زندہ تھے جن کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں البتہ تشحیذ کے پرچوں میں محفوظ ہو گا۔ انہوں نے یہ اعتراض لکھ کر بھیجا تھا کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں تو موت اور سزا دونوں شامل ہیں۔ پھر شروع میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہنے کا کیا مطلب ہوا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے معنی ہیں کہ سب تعریفیں خدا کے لئے ہیں اور رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے معنی ہیں وہ سب کی ربوبیت کرتا ہے پھر اس کے ساتھ سزا کے ذکر کے کیا معنی ہوئے۔ مَیں نے اس کاجواب یہ دیا تھا کہ یہاں رحمت کا پہلو موجود ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقِ مغفرت کو قائم رکھتا ہے اور جب خدا تعالیٰ کا یہ حق ہے تو اَلْحَمْد کہنے کا موقع موجود ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیسیوں مجسٹریٹ ایسے ہوتے ہیں جو منصف اور نرم دل ہوتے ہیں اور ان کے متعلق کئی مجرم آپس میں بات چیت کرتے ہیں تو کہتے ہیں شکر ہے ہمارا مقدمہ فلاں مجسٹریٹ کے پاس ہے اور فلاں کے پاس نہیں گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے متعلق جو مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہہ کر رحم کی امید دلاتا ہے۔ باوجود سزا اور موت کا ذکر ہونے کے انسان کیوں نہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہے۔ اگر ہمارا مقدمہ کسی ایسے مجسٹریٹ کے سپرد ہو جاتا جو رحم کرنا جانتا ہی نہ ہوتا تو پھر سزا میں

کیا شبہ رہ جاتا۔ اس صورت میں سزا سے بچنا محال تھا۔ اگر کسی کا انجام توبہ پر بھی ہوتا تو بھی وہ سزا سے نہ بچ سکتا کیونکہ وہ جانتا کہ خدا تعالیٰ تو رحم کر ہی نہیں سکتا۔ اس نے سزا بہر حال دینی ہے۔ مگر یہاں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہہ کر یہ امید دلا دی کہ اگر انجام بھی خراب ہو تو بھی نا امیدی کی کوئی بات نہیں کیونکہ خدا تعالیٰ پھر بھی معاف کر سکتا ہے۔ پس یہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنے کے یہ معنی ہیں کہ شکر ہے ہمارا مقدمہ کسی ایسے مجسٹریٹ کے پیش نہیں ہو رہا جو رحم کرنا نہیں جانتا۔ یہاں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہہ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ رحم کر سکتا ہے اور رحم کی امید دلاتا ہے۔ ایسی صورت میں روزانہ ہم مجرموں کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہتے دیکھتے ہیں۔ مگر جہاں اللہ تعالیٰ یہ فرمائے کہ تم نے جتنا دوڑنا ہو دوڑ لو۔ اپنی تمام تدابیر اختیار کر لو پھر بھی تم ہماری سزا سے نہیں بچ سکتے۔ ہم تم کو ضرور سزا دیں گے اور ایسا عذاب دیں گے کہ بھون کے رکھ دیں گے۔ اس کے بعد کہنا کہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ مگر نئے اور پرانے مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت کے معنی یہی ہیں۔ ممکن ہے کسی کو اختلاف بھی ہو۔ مَیں نے ساری تفاسیر نہیں دیکھیں مگر جو دیکھی ہیں ان سب کا ان معنوں پر اتفاق ہے اور جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے مجھے ان معنوں سے اختلاف ہے اور ان وجوہ سے جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔ میرے نزدیک اس کے معنی سیدھے سادے ہیں اور ان الفاظ کے اندر بھاری حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا یعنی اے بڑے لوگوں کے گروہ اور اے چھوٹے لوگوں کے گروہ اور اے حکام کے گروہ اور اے عوام کے گروہ۔ دنیا میں دو ہی قسم کی حکومتیں ہوتی ہیں ایک آسمانی یعنی مذہبی اور اخلاقی اور دوسری زمینی یعنی قانون فطرت اور قانون سائنس کی۔ یہ دو حکومتیں جاری ہیں جن کو بسا اوقات انسان اپنی نادانی سے اپنے لئے بوجھ سمجھتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے موت بنائی ہے اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی رحمت ہے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ یہ رحمت ہے۔ لوگ عام طور پر اس سے گھبراتے ہیں۔ مگر موت

کو اڑا کر دیکھ لیں۔ پھر کس طرح اپنے آپ پر ساری دنیا اور زمین و آسمان پر لعنتیں ڈالنے لگتے ہیں۔ دنیا میں انسان والد، والدہ، دادا، دادی، نانا، نانی، وغیرہ قریبی رشتہ داروں کی موت کے صدمہ کو کتنا محسوس کرتے ہیں اور یہ احساس ایک طبعی تقاضا ہے لیکن اگر یہ احساس اتنا بڑھ جائے کہ انسان سمجھے خدا نے بڑا ظلم کیا ہے جو موت پیدا کی۔ مَیں اسے اڑا دوں گا اور وہ اسے اڑانے میں کامیاب ہو جائے۔ تو ذرا تصور کرو کیا حالت ہو۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں لے لو۔ قادیان کے اردگرد چھوٹے چھوٹے گاؤں ننگل، بھینی اور کھارا ہیں۔ آج بھی ان گاؤں کے زمینداروں کی حالت بہت غربت کی ہے کسی کے پاس چار گھماؤں زمین ہے۔ کسی کے پاس پانچ، کسی کے پاس آٹھ اور کسی کے پاس دس گھماؤں ہے۔ جس سے موجودہ افراد بھی بڑی تنگی سے گزارہ کرتے ہیں اور بعض نے تو تنگ آ کر جو تھوڑی بہت زمین تھی فروخت کر دی اور اب محنت و مزدوری کر کے گزارہ کر رہے ہیں۔ اب ذرا غور کرو اگر ان کے باپ دادا، پردادا او رپھر آدم تک سات ہزار سال میں جتنے لوگ تھے سب زندہ ہوتے پھر ان کی مائیں دادیاں، پردادیاں بھی آخر تک زندہ ہوتیں پھر ان کے چچے چچیاں آخر تک زندہ ہوتے تو کیا ان کے پاس ایک گھماؤں چھوڑ ایک ایک مرلہ زمین بھی ہوتی؟ ایک مرلہ تو کجا ناخن کے کاٹے ہوئے حصہ کے برابر زمین بھی کسی کے حصہ میں نہ آسکتی۔ اور جب یہ حالت ہوتی تو یہ لوگ کھاتے کہاں سے پھر راتوں کے سونے کے لئے بھی جگہ نہ ملتی۔ راتوں کو ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے کے اوپر تیسرا اور تیسرے کے اوپر چوتھا حتّٰی کہ ایک ایک پر پچاس پچاس آدمی سوتے۔ تب بھی شاید سب کے لئے لئے جگہ نہ مل سکتی۔ سائنس والے دنیا کی عمر دو کروڑ سال بتاتے ہیں اور ہندوؤں کی تو ہر چیز بے حساب ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک دنیا کی عمر اربوں ارب سال ہے اور مسلمانوں کے نزدیک چھ ہزار سال ہے۔ اربوں ارب سال کو جانے دو۔ دو کروڑ سال کو بھی جانے دو صرف چھ ہزار سال ہی لے لو۔ اگر چھ ہزار سال کے لوگ سب کے سب زندہ ہوتے تو کیا حال ہوتا۔ سب

کے سب زمین پر لیٹ کر سو بھی نہ سکتے۔ جس طرح جنگ میں لاشیں ایک دوسری کے اوپر ڈالی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کے اوپر اگر سب کو ڈالا جاتا تو شاید سونے کی جگہ مل سکتی۔ بے شک دم تو گھٹتا مگر موت تو آنی نہ تھی۔ اگر یہ حالت ہوتی تو غور کرو کس طرح لوگ اپنے آپ پر اپنے ماں باپ اور دادا پردادا پر بلکہ زمین و آسمان پر لعنتیں بھیجتے اور کس طرح موت کو ایک رحمت سمجھا جاتا۔ اگر موت نہ ہوتی تو ساری دنیا کے عقلمند ایسی ایجادوں میں لگے ہوتے کہ کس طرح موت ایجاد کی جا سکے جس چھوٹے سے گھر میں ہزاروں سال کے تمام لوگ زندہ ہوتے اور اس کا صحن 20x10 فٹ ہوتا۔ اس میں کیا حال ہوتا۔ نہ کھانے کو برتن مل سکتے نہ پینے کو پانی۔ جوان بوڑھوں کے اور بوڑھے بچوں کے گلے گھونٹتے کہ کسی طرح مر جائیں مگر موت پھر بھی نہ آتی۔ اس وقت تو اگر کسی کا باپ یا دادا فوت ہو جائے تو روتے ہیں مگر موت نہ ہونے کی صورت میں لوگ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے اور کہتے کہ کم بخت مرتا بھی نہیں اور قانون قدرت اور مذہب کو گالیاں دیتے۔ تو موت بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے اور قرآن کریم ہی ایک کتاب ہے جو صفائی سے اس امر کو پیش کرتی ہے۔ بے شک انسان کوشش کرے کہ تندرست رہے، بیماریوں سے بچا رہے مگر چاہئے کہ موت کے لئے بھی تیار رہے اور امید رکھے کہ میں نے ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ یہ موت اگر نہ ہوتی تو انسان کو اس کے لئے دعا کرنی پڑتی۔ یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے جب انسان پر ایسا وقت آتا ہے کہ اگلی نسل اس سے تنگ آ جائے تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اسے موت دے دیتا ہے مگر انسان جوں جوں سائنس میں ترقی کرتا ہے موت کو اڑانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا ہے۔ کبھی اس امر کی تحقیق ہوتی ہے کہ انسان کے دل کو دوبارہ کس طرح حرکت میں لایا جا سکتا ہے اور کبھی اس کی کہ بجلی کے ذریعہ انسان کو کس طرح زندہ رکھا جا سکتا ہے اور یہ خیال نہیں کرتا کہ اگر موت پر قابو پا لیا جائے تو اس کے بعد دنیا کے لئے جو ایجاد سب سے اہم سمجھی جائے گی وہ یہی ہو گی کہ کس طرح موت کو

واپس لایا جا سکتا ہے۔ پس موت دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت ہے۔ لیکن انسان ان تمام قوانین سے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدہ کے لئے بنائے ہیں ان سب سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

آجکل رمضان ہے۔ روزہ سے ہوں تو پتہ لگتا ہے کہ بھوک کتنی تکلیف دہ چیز ہے۔ میرے جیسے کمزور آدمی کے لئے تو خاص طور پر تکلیف دہ ہے۔ اس وقت میں جوش میں اتنا بول گیا ہوں ورنہ جب میں کھڑا ہوا تو میرا خیال تھا کہ پانچ سات منٹ سے زیادہ نہ بول سکوں گا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ہے کہ جب طبیعت میں جوش پیدا ہو تو انسان پہلی تکلیف کو بھول جاتا ہے۔ غرض روزہ میں بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے۔ آجکل مجھے بھوک تو نہیں لگتی، پیاس لگتی ہے اور عصر کے بعد تو اتنی پیاس لگتی ہے کہ مَیں نڈھال ہو جاتا ہوں ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ہوتی ہیں یا تو میں سونے کی کوشش کروں اور یا پھر ٹہلنے لگوں۔ ٹہلنا ہمارے خاندان کی ایک عادت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بھی ٹہلنے کی عادت تھی۔ عصر کے بعد مجھے پیاس کا اور کوئی علاج نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ مَیں ٹہلوں۔ تو بھوک اور پیاس بہت تکلیف دِہ چیزیں ہیں مگر دنیا کی لذتوں کا بہترین حصہ بھوک اور پیاس سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں مَیں نے پڑھا کہ شہد میں بڑی برکت ہے۔ ایک دوست شہد لے آئے پہلے ہی روزہ میں میں نے خیال کیا کہ اس میں اتنی برکتیں ہیں، اسی سے کیوں نہ روزہ کھولیں۔ چنانچہ شہد میں پانی ڈال کر رکھ دیا اور جب اس سے روزہ کھولا تو یوں معلوم ہوا کہ یہ شہد نہیں بلکہ جنت سے کوئی چیز آئی ہے۔ اگر پیاس نہ ہو تو یہ مزا کیسے آئے۔ میرا معدہ خراب ہے اس لئے پانی پینے کے بعد مجھے بھوک تو لگتی نہیں مگر رمضان نہ ہو تو مَیں نے دیکھا ہے سیر کر کے واپس آئیں اور بھوک لگی ہوئی ہو تو کھانے کا بہت ہی مزا آتا ہے۔ مجھے بہت سے کھانے کھانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یورپ کے سفر کے دوران مجھے مصری کھانے کھانے کا بھی موقع ملا، اطالوی کھانے کھانے کا بھی، فرانسیسی کھانے کھانے کا بھی اور انگلستان کے

کھانے کھانے کا بھی۔ ہماری والدہ دہلی کی رہنے والی ہیں۔ اس لئے اس علاقہ کے کھانے بھی کھائے ہیں۔ پھر ہم مغل ہیں اور بعض کھانے مغلوں کے خاص ہیں وہ بھی کھائے ہیں اور اس طرح بہت سے کھانے کھائے ہیں مگر بچپن سے جس کھانے کے مزیدار ہونے کا مجھ پر اثر ہے اور جو بھوک کے نتیجہ میں تھا وہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ مَیں چھوٹا تھا۔ تین چار سال کی عمر تھی اور آنکھیں دُکھتی تھیں کھانے کا پرہیز کرایا جاتا تھا اور صرف دودھ دیا جاتا تھا۔ میری ایک کھلائی تھی۔ میری آنکھوں میں تکلیف تھی رڑک ہو رہی تھی اور وہ کھلائی مجھے اٹھا کر دالان میں ٹہلاتی اور بہلاتی تھی۔ وہ غریب عورت تھی اور اسے بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے رات کا باسی ٹکڑا ہاتھ میں لئے کھاتی جاتی تھی اور مجھے بہلاتی بھی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے اس باسی ٹکڑے سے زیادہ خوشبو دار اور لذیذ چیز کوئی اور نہیں لگی۔ اس کے ساتھ کوئی سالن یا دال بھی نہ تھی۔ خالی روٹی کا ٹکڑا تھا اور وہ بھی باسی مگر اس کی سوندھی سوندھی خوشبو ہزاروں مرغوں سے زیادہ دل پسند تھی بلکہ اب بھی یاد کر کے وہ خوشبو مجھے آنے لگتی ہے۔ تو یہ بھوک کا ہی کمال ہے جس سے کھانے کا مزا آتا ہے۔

ایک قصہ مشہور ہے کہتے ہیں کوئی پٹھان محنت و مزدوری کے لئے اپنے وطن سے ہندوستان آیا۔ وہ کسی جگہ مزدوری پر لگا ہؤا تھا گھر تو یہاں تھا نہیں کہ روٹی کا کوئی انتظام ہوتا۔ اس نے خیال کیا کہ کھانے کا وقت آئے گا تو کوئی چیز لے کر کھا لوں گا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو کوئی عورت خربوزے بیچتی ہوئی ادھر سے گزری۔ اس نے اس سے دو چار آنے کے خربوزے لے لئے جو بہت سے آ گئے۔ اوروہ انہیں کھانے لگا۔ کھاتے کھاتے جب پیٹ بھر گیا تو کہنے لگا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے جو مَیں کھا رہا ہوں۔ ان کا سردہ بہت زیادہ میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے اور ہمارے ہاں کا خربوزہ اس کی نسبت بہت پھیکا۔ تو اس نے خیال کیا کہ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ ہندی خربوزہ ہرگز کھانے کے قابل نہیں چنانچہ وہ اٹھا اور کھڑے ہو کر ان پر پیشاب کر دیا اور چلا گیا۔ کام پر جا کر جب ایک دو گھنٹہ کہی چلائی تو پھر بھوک

لگ گئی۔ اس پر اسے پھر خربوزوں کا خیال آیا چنانچہ آیا اور ان کو دیکھا مگر ان پر پیشاب کر چکا تھا اس لئے خربوزوں کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ آخر ان میں سے ایک کو اٹھایا اور کہا کہ اس پر تو پیشاب نہیں پڑا اور اسے کھا گیا۔ مضبوط اور جوان آدمی کو ایک خربوزے سے کیا ہوتا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں ہی پھر بھوک لگ گئی۔ پھر آیا اور دوسرا خربوزہ اٹھا کر کہنے لگا کہ اس پر بھی نہیں پڑا تھا اور اسے بھی کھا گیا۔ اسی طرح کرتے کرتے سوائے ایک کے سب کھا گیا اوروہ ایک بھی اس لئے چھوڑ دیا کہ کسی ایک پر تو پیشاب پڑنا ماننا ہی پڑتا تھا۔ شام کو جب بہت بھوک لگی اوروہ زیادہ تنگ ہوُا تو کہنے لگا کہ مَیں بھی کیسا عجیب آدمی ہوں جن خربوزوں پر پیشاب پڑا تھا وہ تو کھا گیا اور جس پر بالکل نہیں پڑا تھا اسے چھوڑ دیا اور یہ کہہ کر اسے بھی اٹھا کر کھا لیا۔ تو بھوک اور پیاس سے ہی کھانے اورپینے میں مزا آتا ہے۔

جب بھوک ہو تو ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی مل جائے تو اس کا بھی مزا آتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر آدمی کو کہیں سے گنا مل جائے تو اسے بھی وہ لطف لے لے کر چوستا ہے۔ بھنے ہوئے دانے مل جائیں یا مکئی کا بھٹا مل جائے تو ایسی لذت آتی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ لوگ مرغ بھون کر کیوں کھاتے ہیں اس سے زیادہ لذیذ تو وہ نہیں ہوتا حالانکہ یہ سب بھوک کی وجہ سے ہے مگر کبھی انسان بھوک کی شکایت کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے خدا تعالیٰ نے بھوک کیا بنا دی ہے، پیاس کیا بنا دی ہے، بیماریاں کیا بنا ئی ہیں، موت کیا بنائی ہے حالانکہ یہ سب دراصل اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں۔ غریبوں کے لئے بیماریاں بھی رحمت ہو جاتی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنا بچپن کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے فرماتے ایک چوہڑا ہمارے ہاں ملازم تھا آپ ایک دفعہ کھیلتے کھیلتے اس کے گھر چلے گئے اور لڑکے بھی تھے۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ تمہیں کیا چیز سب سے زیادہ پسند ہے اس چوہڑے سے پوچھا تو اس نے کہا کہ ”مٹھا مٹھا تاپ ہووے۔ مینہ پینْدا ہووے تے بھجے ہوئے دو سیر چھولے ہون اُتّے رضائی ہووے۔“ یعنی ہلکا ہلکا بخار ہو، بارش ہو رہی ہو، بھنے ہوئے دو سیر چنے

پاس پڑے ہوں اور اوپر اوڑھنے کے لئے رضائی ہو۔ آپ فرماتے تھے۔ہم نے پوچھا کہ چنے تو کھانے کی چیز ہے، رضائی اوڑھنے کی، ان سے تو آرام ملتا ہے مگر یہ ہلکا ہلکا بخار جو تم چاہتے ہو اس کا کیا مطلب ہے۔اس نے کہا کہ اگر بخار زیادہ ہو تو اس سے تکلیف ہو گی اور اگر بالکل نہ ہو تو کام سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ ابھی آدمی آ جائے گا کہ چلو مرزا جی بلاتے ہیں۔ تو غریبوں کے لئے بیماری بھی بعض اوقات رحمت ہو جاتی ہے۔ ان میں اَور بھی فوائد ہیں۔ بیماری ان زہروں کا ازالہ کر دیتی ہے جو انسان کے اندر جمع ہو رہے ہوتے ہیں ورنہ ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ انسان کھڑے کھڑے مر جائے۔ اندر صَفرا پیدا ہوتا ہے تو قے آ جاتی ہے، دست آنے لگتے ہیں اور اس طرح صَفرا نکل جاتا ہے جو اگر اندر رہتا تو کئی بیماریاں پیدا کرتا، استسقاء ہو جاتا اور انسان مر جاتا۔

ہر بیماری جو انسان کو آتی ہے وہ کیا ہے۔اگلی بیماری کا نوٹس ہے۔نزلہ نوٹس ہے سل کا۔ ہلکا ہلکا بخار نوٹس ہے سل اور دق کا۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے گویا ایک چٹھی ہے۔خدا تعالیٰ ڈاک میں چٹھی نہیں بھیجتا بلکہ جسم کے اندر ہی ایسی تبدیلی کر دیتا ہے کہ جس سے پتہ لگ جائے۔نزلہ ہونا گویا خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک کارڈ ہے۔ ایک مہینہ دو مہینہ کے بعد سل ہونے والی ہے۔ کھانسی نوٹس ہے اس بات کا کہ سل ہونے والی ہے۔ہلکا ہلکا بخار نوٹس ہے اس امر کا کہ تپ دق ہونے والا ہے۔ تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں ہیں۔ مگر انسان ان سب سے گھبرا کر ان سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ حکومتوں سے بھی آزاد ہو جاؤں۔ حکومتیں تلواروں اور نیزوں سے کام لیتی ہیں۔ اس لئے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے انسان نے بندوق ایجاد کی، پستول نکالا مگر جب حکومت کو علم ہوُا تو اس نے کہا اس ایجاد کے لئے تمہارا شکریہ۔ تم نے ایسا اچھا ہتھیار دریافت کیا جو پہلے نہ تھا اور اس نے اپنی فوج اور پولیس کو بندوق اور پستولوں سے مسلح کر دیا۔ پھر انسان نے کہا حکومتیں ظالم ہیں اور ان کے مقابلہ کے لئے اس نے توپ ایجاد کی اور کہا کہ یہ

ہتھیار بندوق کو اڑا دے گا مگر اسے بھی حکومت نے سنبھال لیا اور اپنی فوجوں کو توپوں سے مسلّح کر دیا۔ عوام پھر بھی بغیر ہتھیار کے رہ گئے اور حکومتیں پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور ہو گئیں۔ پھر انسان نے ہوائی جہاز نکالے، بم نکالے اس پر حکومت اور بھی خوش ہوئی اور اس نے سمجھ لیا کہ اب رعایا ہمارا مقابلہ بالکل ہی نہ کر سکے گی۔ غرض بعض لوگ حکومتوں کو ایک مصیبت خیال کرتے ہیں اور ان سے بچنا چاہتے ہیں مگر اور زیادہ مصیبتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ زار کی حکومت جو روس میں تھی اور اس زمانہ کے ڈکٹیٹروں کی حکومتیں بھی اس سے کم نہیں۔ یہ سب اس بات کا نتیجہ ہیں کہ انسان نے خدا تعالیٰ کی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ اگر لوگ خدا تعالیٰ کے قانون کے ماتحت چلتے تو یہ مصائب کبھی نہ آتیں۔ آج سے 30،25 سال قبل سائنسدان اس بات پر کتنے مغرور تھے کہ انہوں نے دنیا کی پیدائش کا سوال حل کر لیا۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کا سوال تو حل نہیں ہوا البتہ موت کا سوال بڑا اچھا حل کیا گیا ہے۔ وارسا جیسا شہر جس کی آبادی دس لاکھ تھی۔ تین دن کی بمباری سے بالکل تباہ ہو گیا۔ تو زندگی کا سوال تو ویسا کا ویسا ہی رہا البتہ موت کا سوال خوب حل ہوا۔

یہ کتنی واضح بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی کہ اے میرے بندو! تم وہ رستے تلاش نہ کرو کہ جن سے میرے قانون سے باہر جا سکو۔ اگر تم ایسی کوشش کرو گے تو لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ۔ یعنی سلطان تمہارے ساتھ ساتھ ہو گا اور تم خدا تعالیٰ کے قانون سے کسی صورت میں باہر نہ جا سکو گے۔ دیکھ لو کیسے سیدھے سادے معنے ہیں جن میں کوئی محذوف بھی نکالنا نہیں پڑتا۔

اسی طرح مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ میں آسمانی قانون کا ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی بھاگنے کی لوگوں نے کتنی کوشش کی ہے۔ بڑی کوشش کی گئی ہے کہ کسی طرح مذہب کا قائمقام عقل سے نکالیں اور بعض قائم مقام نکالے بھی گئے مگر دیکھ لو ان سے کیا سُکھ ملا ہے۔ روسیوں نے بولشو ازم[4] نکالا۔ جرمنوں نے ناٹسی ازم۔ مگر کیا

ان سے لوگوں کے دکھ کم ہوئے۔ ہرگز نہیں بلکہ اَور بڑھ گئے۔ ان سے شکایات اور تکالیف اور بھی بڑھ گئیں۔ انسان نے خد اتعالیٰ کی غلامی سے نکلنا چاہا مگر اس سے بھی بدتر غلامی میں مبتلا ہو گیا پھر انسان نے کیا کیا قوانین نکالے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے صحابہ تک تو یہ قانون مانتے آئے ہیں کہ بعض ضرورتوں کے ماتحت ایک سے زیادہ بیویاں کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے مگر یورپ نے یہ قانون بنایا کہ ایک ہی بیوی ہونی چاہئے۔ ایک سے زیادہ حرام کاری ہے اور اس کے نتیجہ میں یورپ ہزارہا سال تک ایسی بدکاری میں مبتلا ہوُا کہ جسے دور کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا اور آج پھر یہ آوازیں آنے لگی ہیں کہ ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے کیسا فطرت کے مطابق قانون بنایا تھا کہ ساری اولاد جائداد اور ترکہ کی وارث ہو مگر یورپ نے اسے چھوڑا تو دیکھو کیسی خطرناک کیپیٹلزم کی لعنت کا شکار ہوُا اور کس طرح اس قانون نے جہاں ایک گروہ سرمایہ داروں کا پیدا کر دیا وہاں دوسری اولاد کو سوسائٹی کے لئے لعنت بنا دیا۔ سرمایہ چند ہاتھوں میں جمع ہو گیا۔ اگر خدا تعالیٰ کے قانون پر عمل کیا جاتا تو ایسا کبھی نہ ہو سکتا۔ فرض کرو کسی کے پاس پچاس ہزار ایکڑ زمین ہوتی اور اب تک اگر دس نسلیں بھی مان لی جائیں اس کے دو لڑکے ہوتے تو ان کو 25،25ہزار ایکڑ زمین مل جاتی پھر اگلی نسل میں بھی دو دو ہی لڑکے ہوتے تو ½ 12-½ 12 ہزار ایکڑ ہوجاتی اور اسی طرح اگر ہر نسل میں دو دو ہی لڑکے فرض کئے جائیں تو تیسری نسل میں¼ 6-¼ 6 ہزار۔ چوتھی میں قریباً 31،31 سو۔ پانچویں میں پندرہ پندرہ سو۔ چھٹی میں½ 7-½ 7۔ ساتویں میں قریباً ½ 3-½ 3 سَو۔ آٹھویں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو۔ نویں میں75،75 اور دسویں میں37،37ایکڑ۔ اور اس طرح وہ ایک معمولی حیثیت کے زمیندا رہوتے۔ مگر یورپ نے قانون سے تمام پچاس ہزار ایکڑ بڑے لڑکے کے لئے ہی مخصوص کر کے باقی تمام اولاد کو غریب کر دیا اور اس طرح چند لوگ تو بڑے بڑے لارڈ بن گئے مگر باقی غریب رہ گئے۔ اگر اسلامی قانون پر عمل کیا جاتا تو آج کوئی لارڈ

نہ ہوتا۔ پچاس ہزار ایکڑ اراضی بھی دس نسلوں کے بعد35،35 ایکڑ رہ جاتی اور وہ بھی اس صورت میں کہ دو دو ہی لڑکے فرض کئے جائیں حالانکہ بعض لوگوں کے لڑکے تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس تک بھی ہو سکتے ہیں اور اگر اتنے اتنے لڑکے ہوتے تو آج ایک ایک کنال زمین بھی ان کے حصہ میں نہ آتی۔ تو یورپ نے خدائی قانون کو تو اس لئے چھوڑا تھا کہ اس سے ان کی عظمت اور وقار میں اضافہ ہو گا۔ مگر ایسا غلامی کا طوق ان کے گلے پڑا کہ آج پچھتاتے پھرتے ہیں۔

سچے مذہبی یعنی اسلام میں بھی مولویوں نے کئی باتیں داخل کر دیں اور کئی بہانے نکالے کہ خداتعالیٰ کے احکام سے کس طرح بچا جا سکتا ہے انہوں نے کہا کہ فلاں حکم سے بچنے کا فلاں حیلہ ہے اور فلاں سے بچنے کا فلاں۔ اور پورا زور لگایا کہ کسی طرح ایسے حیلے تراش لئے جا سکیں جن سے خدا تعالیٰ کے احکام کو نہ ماننا پڑے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ خوب یاد رکھو تم اس سے باہر نہیں نکل سکتے اور جب بھی نکلو گے خدائی سلطان کے ساتھ نکلو گے ورنہ اپنے حیلے بہانوں سے اور بھی تکالیف میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ مولویوں نے جو حیلے بہانے نکالے ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام چُھوٹا اور ساتھ ہی وہ عزت بھی جاتی رہی جو مسلمانوں کو حاصل تھی۔ وہ دُنیوی لحاظ سے بھی ایسے ذلیل ہو گئے کہ آج جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ کُجا یہ حالت تھی کہ ایک مسلمان بادشاہ ذرا بھی خفگی کا اظہار کرتا تو سارا یورپ تھرّا اٹھتا تھا اور کُجا یہ کہ آج اگر ساری اسلامی حکومتیں مل کر بھی کسی ایک بڑی یوروپین حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتیں۔ افغانستان، عراق، عرب، ایران، مصر اور ترکی سارے مل کر بھی اگر انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہیں تو چھ ماہ نہیں کر سکتے۔ اگر سارے مل کر روس کا مقابلہ کرنا چاہیں تو چھ ماہ نہیں کر سکتے۔ سارے مل کر جرمنی کا مقابلہ کرنا چاہیں تو چھ ماہ نہیں کر سکتے، امریکہ کا مقابلہ کرنا چاہیں تو چھ ماہ نہیں کر سکتے۔ ایشیائی طاقت جاپان کا مقابلہ بھی چھ ماہ نہیں کر سکتے۔ یہ کتنا بڑا تغیر ہے۔ کُجا یہ حالت تھی کہ مسلمانوں کا

خلیفہ مدینہ میں بیٹھا ہوا کوئی بات کہتا تو قیصر روم قسطنطنیہ میں تھر تھر کانپ اٹھتا تھا اور کُجا آج یہ حالت ہے کہ باوجود اس کے کہ بادشاہت نے خلافت کی جگہ لے لی مگر سارے مسلمان ممالک مل کر یورپ کی کسی ایک بڑی طاقت کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کوشش کی کہ قرآن کا جوُا پھینک کر آزاد ہو جائیں مگر اور بھی زیادہ غلام ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ کہ تم اس قانون سے نکل نہیں سکتے۔ حتّٰی کہ اسلام جو سچا مذہب ہے اس میں اگر کوئی خرابی تم خود بھی داخل کر لو تو اس سے بھی خود بخود نہ نکل سکو گے۔ اس سے بھی کوئی مامور ہی آ کر تمہیں نکالے گا۔ دیکھ لو وہابیوں نے کتنا زور مارا کہ حنفیوں نے جو رطب و یابس اسلام میں داخل کر دیا ہے اسے نکال دیں مگر کامیاب نہ ہو سکے بلکہ اسے صاف کرتے ہوئے ساتھ ہی قرآن کریم پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ اور صرف بخاری ہی بخاری رہ گئی۔ فرمایا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔ اگر خدا تعالیٰ کے دین میں تم خود کوئی بات داخل کر لو تو اس سے بھی تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی سلطان یعنی مامور ہی آکر نکالے گا۔ تم خود اس سے بھی نہ نکل سکو گے۔ اگر تم نے سچے مذہب میں کوئی گمراہی بھی داخل کر لی ہے تو چونکہ وہ دین کا جزو بن چکی ہے اس لئے اپنے دین کی عظمت کے پیشِ نظر خدا تعالیٰ تمہیں وہ گمراہی بھی نہیں نکالنے دے گا۔ ورنہ تم میں یہ غرور پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید ہم بھی دین بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ سچے دین سے خرابیوں کو دور کرنے کے لئے بھی مامور کی ضرورت ہے۔ گو وہ خرابی جسے اس نے نکالنا ہے بندوں نے ہی پیدا کی ہو۔ مگر احتیاط کا پہلو یہی ہے کہ اسے خود نہ نکال سکو بلکہ وہ خرابی بھی اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ہی نکل سکتی ہے یعنی ہم اس کی اصلاح کے لئے مامور بھیجتے ہیں۔ اس گمراہی سے نجات بھی سلطان کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ تم خود اس سے نجات نہیں پا سکتے اور یہ احتیاط اس لئے کی جاتی ہے کہ تا تم دودھ میں سے مکھی نکالتے نکالتے دودھ بھی ضائع نہ کر دو۔ خدا تعالیٰ

کے دین کو تم نے منسوخ کر دیا اور اس میں گند ملا لیا اور اس طرح خدا تعالیٰ کے قانون سے بچنے کی کوشش کی مگر اب اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہیں اسی کی غلامی کرنی پڑے گی جب تک کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی مامور آ کر اس کی اصلاح نہ کر دے۔ پس اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اگر تم مذہب کے قانون سے آزاد ہونے کی کوشش کرو گے تو بھی آزاد نہیں ہو سکتے بلکہ اس سے اور مصائب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اب دیکھ لو یہ معنی کرنے کے بعد فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کیسا مطابق بیٹھتا ہے یعنی تم خدا تعالیٰ کی کون کون سی نعمت کا انکار کرو گے۔ اگر ہم نے یہ قانون نہ بنایا ہوتا تو تم کیسے گڑھوں میں گر جاتے۔ یہ حد بندی اگر نہ ہوتی، اگر مذہب کی اصلاح کا اختیار انسان کو ہوتا تو پتہ نہیں کہ وہ سچے دین کو کیا سے کیا بنا دیتا یا اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو قانون قدرت کو بدل دیتا اور سائنس کی مدد سے موت کو اڑا دیتا اور اس طرح خطرناک مصائب کا شکار ہو جاتا۔ اگر قانون فطرت یا قانون شریعت کو بدلنے کا اختیار انسان کو ہوتا تو وہ اپنے لئے ایسی ایسی مصیبتیں پیدا کر لیتا کہ جن سے پھر نکل نہ سکتا۔ مثلاً فرض کرو موت کو اڑانے کا اختیار اسے ہوتا تو کس طرح مشکلات پیش آتیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ موت کو اپنے اختیار میں رکھ کر ہم نے تم پر رحم کیا ہے۔ اگر مارنا یا جلانا انسان کے اختیار میں ہوتا تو یہ دونوں چیزیں اس کے لئے مصیبت بن جاتیں۔

پھر فرمایا يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ یعنی دنیا جب کبھی ان قانونوں سے بچنے کی کوشش کرے گی۔ دنیا میں لڑائی اور جھگڑے زیادہ ہوں گے۔ جب انسان قانون قدرت سے بچنے کی کوشش کرے گا تب بھی اور جب قانون مذہب سے بچنے کی کوشش کرے گا تب بھی وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو گا۔

موجودہ جنگ بھی اسی قانون کے ماتحت ہو رہی ہے۔ سائنسدانوں نے کوشش شروع کی کہ وہ انسان کو خدا تعالیٰ سے آزاد کر دیں مگر اس کوشش کا نتیجہ

کیا نکلا؟ بم اور ہوائی جہاز اور اس طرح موت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔ خدائی مذہب نے انسان کی نجات کا جو راستہ تجویز کیا تھا اسے نظر انداز کر کے لوگوں نے بالشو ازم اور ناٹسی ازم نکالے مگر ان سے غلامی اَور بھی بڑھ گئی۔ یہی شُوَاظٌ مِّنۡ نَّارٍ ہے۔ فرمایا جب بھی تم کہو گے کہ سائنس کی ترقی سے ہم خدا تعالیٰ کو بے دخل کر دیں یا خدا تعالیٰ کے قانون کی جگہ خود کوئی قانون بنا لیں تو تم پر اَور زیادہ مصائب آئیں گے بم گریں گے اور آزادی حاصل کرنے کی بجائے اَور بھی غلامی میں پڑ جاؤ گے۔ اگر واقعی مذہب میں خرابی پیدا ہو جائے تو بھی تم اس سے آزاد نہیں ہو سکتے جب تک کہ خدا تعالیٰ کا نبی آ کر تمہیں اس سے نہ نکالے۔ اگر بگاڑ تم نے خود پیدا کیا ہے تو دور اسے خود نہیں کر سکتے بلکہ خدا تعالیٰ کا مامور آ کر ہی اسے دور کر سکتا ہے۔ اسی طرح سائنس جب مذہب سے جدا ہو کر چاہے گی کہ خدا کو پنشن دے دے تو اس کی تحقیقات کے نتیجہ میں بم اور طیارے ایجاد ہوں گے۔ آرام اور سکھ کے سامان نہیں۔ آرام اور سکھ کے سامان اسی صورت میں ایجاد ہوں گے جب خدا تعالیٰ پر یقین ہو اور اس کے قانون کو اپنے لئے راحت کا موجب سمجھتے ہوئے تم کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں مخفی طاقتیں بھی رکھی ہیں۔ آؤ ان کی تحقیقات کریں۔ ان حالات میں جو ایجادیں ہوں گی وہ آرام و راحت اور آسائش کا موجب ہوں گی لیکن جب خدا تعالیٰ پر ایمان نہ ہو گا اور اس کے قانون سے بچنے کی کوشش کی جائے گی تو اس صورت میں ذہن ہمیشہ تکلیف دہ چیزوں کی طرف جائے گا۔ دیکھو مسلمانوں کی ایجادیں دنیا کے سکھ اور راحت کا موجب ہوا کرتی تھیں کیونکہ ان کا خدا پر ایمان تھا۔

غرض خدا تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اس کی دی ہوئی مخفی طاقتوں کی تحقیقات کرنے والے کا ذہن ایسی چیزوں کی طرف جائے گا جو انسان کے لئے سکھ اور راحت کا موجب ہوں لیکن جب خداتعالیٰ پر ایمان نہ ہو بلکہ اس کے قانون سے بچنے کی کوشش کی جا رہی ہو تو ایسا انسان خواہ دوائیاں ہی کیوں نہ بنانے کی کوشش کرے اس کی کوششوں کا نتیجہ بم اور ہلاکت آفرین ایجادیں ہی ہوں گی۔ وہ خواہ

کوئی آرام دہ چیز ہی ایجاد کرنا چاہے مگر نتیجہ بمبار طیارہ کی دریافت ہی ہو گا۔ کیونکہ جب دل میں خدا تعالیٰ کی رحمت کا یقین نہ ہو تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ذہن کسی ایسی چیز کی طرف جا سکے جو انسان کے لئے رحمت کا موجب ہو سکے۔ ایسی حالت میں جو تحقیقات ہو گی اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہ ہو گا اور اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کے قانون کو رحمت سمجھو اور اس سے بچنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر تمہارا ذہن ایسی ایجادوں کی طرف جائے گا جو دنیا کے لئے رحمت کا موجب ہوں گی۔ اسی طرح اگر مذہب میں تمہیں کوئی دقّت پیش آتی ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرو بلکہ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ دعائیں کرو تا خدا تعالیٰ اپنا مامور بھیجے جو آ کر اصلاح کرے اور ان اَغْلَال کو کاٹ دے اگر خود ان کو کاٹنے کی کوشش کرو گے تو وہ اَور پڑ جائیں گے۔

یہ ہے اس آیت کا مضمون میرے نزدیک۔ جسے عذابِ الٰہی تک محدود کر کے مفسرین نے اس سے اگلی آیت فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کا مضمون بھی بگاڑ دیا ہے۔"

(الفضل 29 اکتوبر 1941ء)

---

1 الرّحمٰن : 34 تا 37

2 الفاتحہ: 2

3 الفاتحہ: 3

4 **بالشوازم:** کمیونزم کا روسی نام۔ اس اصطلاح کا استعمال پہلی بار 1903ء میں لنڈن میں ہوا جبکہ روسی سوشل ڈیمو کریٹک پارٹی کے اجلاس میں کارل مارکس کے پیروؤں کو اکثریت حاصل تھی۔ اس کے مقابلہ میں اقلیت کو بولشویک کہا گیا۔ 1917ء کے انقلاب کے بعد بولشویک پارٹی کا نام کمیونسٹ پارٹی ہو گیا۔ (ایوری مین انسائیکلوپیڈیا، اردو انسائیکلوپیڈیا)